

منٹو کے افسانوں میں پسے ہوئے انسان کا بیانیہ: معاشی، جنسی اور نفسیاتی جبر کی مثلث

The Narrative of the Oppressed Human Being in
Manto's Short Stories: The Triangle of Economic,
Sexual, and Psychological Oppression

ڈاکٹر خدیجہ شاہد

لیکچرار، شعبہ اُردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین، گوجرانوالہ

Abstract:

Saadat Hasan Manto's short stories present a powerful narrative of the oppressed human being, shaped by intertwined forms of economic, sexual, and psychological oppression. This study examines how Manto portrays marginalized individuals such as laborers, prostitutes, impoverished men, women, and victims of social and political upheaval as central figures in his fiction. Rather than treating economic deprivation, sexuality, or psychological conflict as isolated themes, Manto constructs a triangular framework in which these forces operate simultaneously to dehumanize the individual. Through realistic characterization, stark situations, and intense psychological insight, Manto exposes the hypocrisy of social morality, class hierarchies, and institutional power. His depiction of sexuality emerges not as sensationalism, but as a consequence of economic exploitation and emotional deprivation, while psychological trauma appears as an inevitable outcome of sustained social pressure.

Key words: Saadat Hasan Manto, Urdu short story, oppressed human being, economic oppression, sexual oppression, psychological oppression, marginalization

فنِ افسانہ نگاری کی تاریخ میں سعادت حسن منٹو کا شمار اُن ممتاز تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو افسانے کو نہ صرف فنی بلندی عطا کی بلکہ اسے سماجی شعور، انسانی کرب اور داخلی صداقت کے اظہار کا ایک مؤثر وسیلہ بھی بنایا۔ منٹو کے ہاں موضوعات کی ندرت، کرداروں کی رنگارنگی، فکری گہرائی، اور منظر نگاری و جزئیات نگاری کا باہمی امتزاج وحدتِ تاثر کی ایسی مثال پیش کرتا ہے جو اردو افسانے کی ایک صدی سے زائد روایت میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے محض واقعات کی پیش کش نہیں بلکہ زندگی کے تلخ اور پیچیدہ تجربات کی زندہ تصویریں ہیں، جن میں قاری خود کو کرداروں کے ساتھ جیتا جاگتا محسوس کرتا ہے۔ منٹو نے مغربی افسانہ نگاروں، خصوصاً موپساں اور چیخوف، سے فنی اثرات قبول کیے، مگر ان اثرات کو تقلید کے بجائے تخلیقی سطح پر برتا۔ انہوں نے ان تکنیکوں کو برصغیر کے سماجی، معاشی اور نفسیاتی حالات کے تناظر میں ڈھال کر ایک بالکل منفرد افسانوی لہجہ اختیار کیا۔ معاشرے کے پسے ہوئے، نظر انداز کیے گئے اور حاشیہ پر دھکیل دیے گئے افراد—جیسے مزدور، طوائف، مفلس مرد، مظلوم عورت اور سماجی جبر کے شکار انسان—منٹو کے افسانوں کے مرکزی کردار بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے منٹو نے نہ صرف سماج کی منافقت کو بے نقاب کیا بلکہ انسانی وجود کے اندرونی تضادات کو بھی بے رحمی سے سامنے رکھا۔

منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء میں شروع ہونے والی ”نئے ادب کی تحریک“ کے زیر اثر ہوا، جو اپنی اساس میں ایک باغی اور انحرافی تحریک تھی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد فرسودہ ادبی اقدار، مصنوعی اخلاقیات اور سماجی جمود کے خلاف آواز بلند کرنا تھا۔ منٹو اس

تحریک کے سب سے جری اور بے باک نمائندہ ادیب کے طور پر سامنے آئے۔ ان کی بغاوت کسی مخصوص نظریے یا جماعت کے لیے نہیں بلکہ اُس سماج کے خلاف تھی جو فطری انسانی جذبات، خواہشات اور سچائیوں پر مصنوعی پابندیاں عائد کرتا ہے اور تہذیب کے نام پر تصنع اور دوغلے پن کو فروغ دیتا ہے۔ اسی فکری پس منظر میں منٹو نے ”جنس“ کو بطور موضوع اختیار کیا، جو اُس دور کے سماج میں سب سے زیادہ ممنوع اور قابلِ اعتراض سمجھا جاتا تھا۔ تاہم منٹو کے ہاں جنس محض جسمانی لذت یا فحاشی کا اظہار نہیں بلکہ ایک سماجی اور نفسیاتی حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ جنس کو انسانی زندگی کے بنیادی تجربے، معاشی مجبوریوں، نفسیاتی الجھنوں اور سماجی جبر کے ساتھ جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح منٹو کا افسانہ محض اخلاقی فیصلوں کا محتاج نہیں رہتا بلکہ انسانی وجود کے پیچیدہ اور تلخ حقائق کی ترجمانی کرتا ہے۔

”منٹو کی افسانہ نگاری دو متضاد عناصر کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ اس کے والد خدا بخشنے بڑے سخت گیر تھے اور اس کی والدہ نہایت رحم دل۔ ان دو پارٹوں کے اندر پس کر یہ دانہ گندم کس شکل سے باہر نکلا ہو گا اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔“ (۱)

منٹو کی افسانہ نگاری تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ابتدا سے ۱۹۳۶ء تک کا ہے۔ اس دور میں منٹو کے اولین افسانے شمار ہوتے ہیں جن میں نہ تو جنسی بے راہ روی کا پردہ فاش کیا گیا ہے اور نہ ہیں کسی طوائف کا تذکرہ ہے۔ اس دور کے افسانوں کے موضوعات بھی عام سے ہیں۔

”منٹو کے افسانوں میں دو خصوصیات ایسی ہیں جو اسے اپنے معاصروں سے بالکل علیحدہ کر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کبھی ایسی چیز کو افسانے کا موضوع نہیں بناتا جس کے کیف و کم سے وہ بخوبی آگاہ نہ ہو۔ اس کی حیرت انگیز قوت مشاہدہ، اس کے ذہن میں واقعات کا تحفظ اور اس کی تیز نظری اس سلسلے میں نظر آتی ہیں۔“ (۲)

منٹو کی ادبی تخلیقات کا دوسرا دور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کا ہے۔ یہ دور سانحہ تقسیم پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں منٹو نے افسانے کو نئی جہات سے متعارف کرایا۔ نئی فضا، تکنیک، سمت اور نئے موضوعات دیے۔ اس دور میں منٹو کا شمار صرف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوا اور ”نیا قانون، شغل، نعرہ، چوہے دان، کالہ شلوار، دھواں، بو، گولی ناتھ اور چغد“ جیسے افسانے وجود میں آئے۔ منٹو کی ادبی نگارشات کا تیسرا دور آخری دور ۱۹۴۸ء سے بوقتِ وفات ۱۹۵۵ء تک کا ہے۔ اس دور میں انہوں نے تقسیم کے سانحے کے حوالے سے متعدد افسانے لکھے۔ منٹو نے تقسیم بر صغیر کو موضوع بنا کر جس تعداد میں افسانے تخلیق کیے اس کی مثال معاصر افسانہ نگاروں کے ہاں نہیں ملتی۔ منٹو کے بیشتر افسانوں کا موضوع عورت ہے۔ یہ عورتیں متنوع اوصاف کی حامل ہیں جنہیں منٹو نے موضوع بنا کر معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ منٹو کے افسانوں کی عورت کے خدو خال دریافت کرنے کے لیے چند افسانوں کا مطالعہ کافی ہے۔ ”کالی شلوار“ منٹو کا مشہور افسانہ ہے جس میں سلطانہ کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ سلطانہ ایک عام گھریلو عورت کی عکاسی کرتی ہے لیکن ایک مرتبہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ ”کالی شلوار“ میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔۔۔ کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹریوں پر چلتا تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔ جانے کہاں! پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ کہیں رک جائے گی۔“ (۳)

منٹو نے یہاں پر عورت اور پٹری کی تمثیل کو پیش کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ منٹو نے عورت کے ہر رنگ و روپ کو موضوع بنایا جس میں طوائف بھی شامل ہے اور عام گھریلو خاتون بھی۔ منٹو نے اپنی قوت مشاہدہ سے عورت کے ہر ناز و نحرے کو بیان کیا ہے چاہے وہ عام عورت میں موجود ہو یا پھر طوائف میں پائے جاتے ہوں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

”منٹو نے اپنے افسانوں میں جنس کو عام زندگی سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہ کی چنانچہ منٹو کے افسانوں میں عام زندگی سے منقطع یا کوئی جد اگانہ وقوع نہیں بلکہ منٹو کی جنس نگاری کا کمال ہے کہ اس نے جنس کے حوالے سے زندگی کو سمجھا اور سمجھایا۔“ (۴)

افسانہ ”شغل“ سڑک بنانے اور پتھر کوٹنے والے مزدوروں کی کتھا ہے جن کی قسمت میں صبح سے شام تک کی بنیاد پر روزانہ بارہ گھنٹے محنت و مشقت کرنا لکھ دیا گیا ہے۔ اتنگ گھنٹوں کی محنت کا معاوضہ فقط چھ آنے ہے جس سے پیٹ کی آگ تک مٹنے کا نام نہیں لیتی۔ وہ بھوک برداشت کرتے ہیں اور خون پسینہ بہا کر کام کرتے رہتے ہیں اور پھر ان کو کام سے نکالے جانے کی دھمکیاں بھی ملتی ہیں۔ منٹو نے مزدوروں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ”افسانہ شغل“ میں وہ مزدوروں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہم میں اکثر کالباس پٹو کے تنگ پانچامے، گاڑھے رنگ کی قمیص اور لدھیانوی کی صدری پر مشتمل تھا۔ سب کے پانچامے گھٹنوں پر گھس کر اتنے باریک ہو گئے تھے کہ ان میں سے جسم کے بالوں کی پوری نمائش ہوتی تھی۔ یہ بالکل پھٹے ہوئے تھے قمیصوں اور صدیوں کی بھی یہی حالت تھی۔ ان پر جگہ جگہ مختلف مختلف رنگ کے پوند لگے ہوئے تھے قریب قریب ہم سب کی قمیصوں کے بٹن غائب تھے اس لیے سینے عام طور پر کھلے رہتے تھے اور کام کرتے وقت ان پر پیٹنے کی بوندیں صرف نظر آسکتی تھیں۔“ (۵)

اس افسانے میں منٹو نے مزدوروں کی معاشی و جسمانی زبوں حالی کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ذہنی اور جملہ کیفیات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ امراء کے شغل کے متعلق حاصل ہونے والی معلومات مزدوروں کے جذبات کو براہِ یختہ کرتی ہیں لیکن وہ احتجاج نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں اپنی بے بسی و بے کسی کا بھرپور احساس ہے۔ منٹو نے سیاسی ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ معاشی اقدار کی ناہمواریوں کو بھی

افسانہ ”نعرہ“ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو الجھنوں، پریشانیوں اور افلاس کا شکار ہے۔ اسے موجودہ سیاسی و سماجی نظام اقدار میں مجوزہ مصائب سے نکلنے کی راہ نہیں ملتی ہے۔ کیشولال کی مفلسی اس قدر بلند ہے کہ وہ اپنی کھولی تک کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا ہے اور جب مالک اس سے کھولی کا کرایہ مانگتا ہے تو اسے سمجھ نہیں آتا وہ کیا کرے۔ ممتاز شیریں کے مطابق اس کا رد عمل سیاسی انسان کی بجائے فطری انسان کا ہوتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

”نعرہ“ کا پس منظر بھی سیاسی اور معاشی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں دولت کی غیر مساوی تقسیم نگ کسی کو اونچا، کسی کو نیچا کر رکھا ہے۔ غریب کیشولال جس کے پاس کرایہ ادا کرنے کے لیے روپے نہیں سیٹھ کے سامنے کھڑا ہے، اپنے دکھوں کا بوجھ اٹھائے۔ وہ التجا کرتا ہے کرایا کچھ بعد میں ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔ دولت مند سیٹھ اپنی بلندی پر سے اس پر گالیوں کی غلاظت پھیلتا ہے۔ کیشولال کو اس کا احساس ہے کہ اس کی غیرت کہ قیمت کچھ بھی نہیں کیونکہ وہ مفلس ہے لیکن جس بات پر افسانے میں سب سے زیادہ توجہ دی گئی ہے وہ گالیاں کھانے کے بعد کیشولال کا رد عمل ہے۔ کیشولال سراپا اضطراب بن گیا ہے۔ ان گالیوں کی غلاظت اسے چٹ گئی ہے۔ ایک بہت ہی گندہ چیز اس نے نگل لی ہے۔ جب تک اسے اگل نہ دے اس کی حالت غیر رہتی ہے۔ جب وہ آخر کار ایک روز نعرہ لگا چکتا ہے ”ہت تیری۔۔۔“ تو اسے ایک حد تک تسکین ہو جاتی ہے۔ یہ رد عمل فطری انسان کا رد عمل ہے۔“ (۶)

تقسیم ہند کے تناظر میں منٹو کے افسانوں میں سیاسی موضوعات بھی ملتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں ”شغل“، ”نعرہ“، ”سوراج کے لیے“، ”نیا قانون“ وغیرہ شامل ہیں۔ ”نیا قانون“ افسانہ ایک تانگے والی کی کہانی ہے۔ منٹو کے سیاسی موضوعات کے حامل افسانوں میں ”نیا قانون“ نمائندہ افسانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۹۵ء کے نئے قانون جسے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا نام دیا گیا کی عکاسی کرتا ہے۔ اس قانون کے تحت ہندوستانیوں کو اپنے حقوق کے حصول کی لڑائی میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی اور ان کے ساتھ رعایتیں بھی برتی گئیں۔ منٹو نے سادگی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف پیدائشی نفرت اور ہندوستان کی سیاسی بے حسی کو ”نیا قانون“ میں سمویا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار منگو کوچو ان ہے جو اپنی برادری کے لوگوں میں دانشمند سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سیاسی شعور بیدار دکھایا گیا ہے اور یہ احساس کہ وہ ایک غلام قوم کا فرد ہے اس کے دل میں انگریزوں کے لیے نفرت کا پہاڑ پیدا کرتا ہے۔ کیم اپریل کو جب نیا قانون لاگو ہوا تو منگو نے سوچا اب برابری کا دور دورہ ہو گا۔ کوئی حاکم اور محکوم نہیں بلکہ سب ایک برابر ہو چکے ہیں۔ وہ ایک انگریز کی ذرا سی بات پر بھڑ گیا لیکن نظام سیاست میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اس لیے اسے گورے کو پیٹنے کے جرم میں جیل جانا پڑا۔ یہ افسانہ موضوع اور فن کی پختگی کا ضامن ہے۔ منٹو نے اس میں حب الوطنی، انسان دوستی اور سیاسی جدوجہد کی عکاسی کی ہے۔ ابو الیث صدیقی کے مطابق:

”یہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دور کا آئینہ دار ہے جس میں ہماری آرزوئیں اور ناکامیاں جھلکتی ہیں اور فنی اعتبار سے بھی یہ ایک کامیاب افسانہ ہے۔“ (۷)

افسانہ ”۱۹۹۱ء کی ایک بات“ میں بھی منٹو نے سیاسی افکار کو موضوع بنایا ہے۔ یہ افسانہ جلیانوالہ باغ کے حادثے کی یادگار ہے۔ اس خونخوار حادثے میں انگریزوں نے ہزاروں زندہ ہندوستانیوں کو شہید کر دیا تھا۔ اس افسانے کی تخلیق کے پیچھے جو سوچ کار فرما رہی وہ یہی واقعہ تھا۔ تھیلا کنجر ایک رنڈی کی اولاد ہے جو انگریزوں کی فرقہ پرستی نہیں سہہ سکتا اس لیے وہ لوگوں کو جمع کر کے انگریزوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس حملے میں طفیل عرف تھیلا کنجر انگریزوں کی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے لیکن جب انگریزوں کو معلوم ہوا کہ اس کی بہنیں شمشاد اور الماس بہت اچھا مچتی گاتی ہیں تو انھوں نے ان کو ناچنے پر مجبور کیا جبکہ طفیل کی قبر کی مٹی خشک تک نہیں ہوئی ہوتی۔ ناچتے ہوئے دونوں بہنیں انگریز افسروں کے منہ پر تھوک دیتی ہیں جس پر انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں سعادت حسن منٹو ایک ایسے تخلیق کار کے طور پر نمایاں نظر آتے ہیں جنہوں نے ادب کو محض جمالیاتی اظہار تک محدود رکھنے کے بجائے انسانی زندگی کے تلخ، پیچیدہ اور نظر انداز کیے گئے پہلوؤں کا آئینہ بنادیا۔ منٹو کے افسانے سماج کے ان طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں جو معاشی استحصال، اخلاقی جبر اور نفسیاتی کرب کے درمیان پس رہے ہیں۔

ان کے ہاں افسانہ محض ایک فنی تجربہ نہیں بلکہ مظلوم انسان کے دکھ، بے بسی اور احتجاج کا بیانیہ بن جاتا ہے۔ مزدور، طوائف، مفلس مرد، فسادات کی شکار عورت اور سماجی حاشیوں پر کھڑا فرد منٹو کے افسانوی کینوس پر مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، جس کے ذریعے وہ سماج کی نام نہاد تہذیب، اخلاقیات اور انسانی قدروں پر گہرا سوال اٹھاتے ہیں۔ منٹو کے افسانوی بیانیے میں انسان کا یہ کرب محض کسی ایک جبر کا نتیجہ نہیں بلکہ معاشی، جنسی اور نفسیاتی جبر کی ایک باہم مربوط مثلث کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ معاشی محرومی انسان کو ایسے حالات میں دھکیلتی ہے جہاں جنس اس کی مجبوری بن جاتی ہے، جب کہ سماجی پابندیاں اور اخلاقی منافقت اس کے باطن میں شدید نفسیاتی انتشار پیدا کرتی ہیں۔ منٹو نے ان تینوں جہات کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے عوامل کے طور پر پیش کیا ہے، جس کے نتیجے میں ”پسا ہوا انسان“ ان کے افسانوں کا مرکزی استعارہ بن جاتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں اسی سہ رخی جبر کے تناظر میں منٹو کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے گا، تاکہ یہ واضح کیا جاسکے کہ منٹو کا فن دراصل انسانی وقار، سچائی اور آزادی کی ایک بے باک فکری جدوجہد ہے۔ وارث علوی کے بقول:

”۱۹۱۹ء کی ایک بات“ بہت ہی اچھا افسانہ ہے۔ منٹو کے لیے یہ بات بہت اہم تھی

کہ انقلاب فرانس میں پہلی گولی ایک تھکیلانی کو لگی تھی اور امرت سر میں گوروں

کی گولی سے ہلاک ہونے والا ایک طوائف کا لڑکا تھا اس کی دو بہنیں شہر کی مشہور

طوائفیں تھیں بھائی کے شہید ہونے کے دو روز بعد انہیں گوروں نے اپنے

سامنے ناچنے پر مجبور کیا افسانے کا یہی دلچسپ موڑ ہے جہاں اس واقعے کا بیان

کرنے والا ٹرین کا مسافر حب الوطنی کے جذبات کے تحت دروغ گوری سے کام

لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ دونوں بہنوں نے الف ننگے ہو کر انگریزوں کے منہ پر

تھو کنا چاہا اور انگریزوں نے دونوں کو گولی سے داغ دیا۔“ (۸)

قصہ مختصر، منٹو کے اس افسانے میں عورت کا کردار مختلف ہے۔ اس افسانے میں جو دو طوائف عورتیں ہیں وہ دیگر طوائفوں سے مختلف اور اعلیٰ درجے کی ہیں کہ دونوں اپنے شہید بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے خود کو قربان کر دیتی ہیں۔

افسانہ ”دیوانہ شاعر“ منٹو کے پہلے افسانوی مجموعے ”آتش پارے“ میں شامل ہے اور یہ افسانہ جلیاں والا باغ کے خونی حادثے اور دردناک منظر کا عکاس ہے۔ موضوعاتی لحاظ سے یہ ایک سیاسی افسانہ ہے جس میں مختلف اور متنوع جذبات پیش کیے گئے ہیں۔ آزادی کے حصول کا مقصد انہیں باہم منسلک رکھتا ہے۔ اس افسانے میں منٹو کا نظریہ یہ ہے کہ انگریزوں سے بغاوت کرنے میں اچھے اور روشن مستقبل کی امید برحق ہو سکتی ہے۔ وہ حب الوطنی اور انسان دوستی کے درس دینے کے ساتھ عوام کی بے کسی اور بے چارگی کو بھی اپنی روح میں حلول ہوتے محسوس کرتے ہیں۔ منٹو ایک انقلابی کی یوں تشریح کرتے ہیں:

”انقلابی وہ ہے جو ہر نا انصافی اور ہر غلطی پر چلا اٹھے۔ انقلابی وہ ہے جو سب زمینوں اور سب آسمانوں، سب زبانوں اور سب وقتوں کا ایک مجسم گیت ہو۔ انقلابی، سماج کے قصاب خانے کی ایک بیمار اور فاقوں مری بھیڑ نہیں۔ وہ ایک مزدور ہے تو مند، جو اپنے آہنی ہتھوڑے کی ضرب سے ہی ارضی جنت کے دروازے وا کر سکتا ہے۔ میرے عزیز یہ منطق خوابوں اور نظریوں کا زمانہ نہیں۔ انقلاب ایک ٹھوس حقیقت کے یہ یہاں موجود ہے اس کی لہریں بڑھ رہی ہیں کون ہے جو اس کو روک سکتا ہے۔ یہ باندھ باندھنے پر نہ رک سکیں گے! اس کا ہر لفظ ہتھوڑے کی اس ضرب کی مانند ہے جو سرخ لوہے پر پڑ کر اس کی شکل تبدیل کر رہا ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ میری روح کسی غیر مرئی چیز کو سجدہ کر رہی ہے۔ شام کی تاریکی بتدریج بڑھ رہی تھی، نیم کے درخت کپکپا رہے تھے۔ شاید میرے سینے میں ایک نیا جہان آباد ہو رہا تھا۔ اچانک میرے دل سے کچھ الفاظ اٹھے اور لبوں سے باہر نکل گئے۔“ (۹)

انسانی نفسیات، بلوغت کے مراحل اور جنسی بے راہ روی جیسے نازک اور پیچیدہ موضوعات وہ ہیں جن پر بڑے سے بڑے ناول نگار بھی اظہار سے گریز کرتے رہے ہیں، تاہم سعادت حسن منٹو نے ان موضوعات کو نہ صرف جرات مندی سے برتا بلکہ انہیں اپنی افسانہ نگاری کا ایک اہم حوالہ بھی بنایا۔ منٹو کے ہاں بلوغت کی نفسیات اور جنسی اضطراب محض ضمنی موضوعات نہیں بلکہ انسانی شخصیت کی تشکیل اور بگاڑ کو سمجھنے کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ انہوں نے ان نفسیاتی کیفیات کو موضوع بنا کر متعدد افسانے تخلیق کیے، جن میں ہر کہانی اپنے اسلوب، فضا اور فنی ساخت کے اعتبار سے ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ اگرچہ ان افسانوں میں موضوعاتی سطح پر ایک باہمی مماثلت دکھائی دیتی ہے، تاہم ہئیت، تکنیک اور اظہار کے زاویے کے لحاظ سے یہ افسانے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ منٹو نے ہر کہانی میں بلوغت کے نفسیاتی تجربے کو نئے تناظر اور مختلف زاویے سے پیش کیا، جس سے ان کے فن کی وسعت اور تخلیقی تنوع واضح ہوتا ہے۔ افسانے ”دھواں“، ”بلاؤز“، ”پھاہا“ اور ”شوشو“ بلوغی نفسیات کے نمائندہ افسانے ہیں، جن میں انسانی جبلت، اضطراب اور داخلی کشمکش کو نہایت باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے۔

افسانے ”دھواں“ اور ”بلاؤز“ میں منٹو نے مردانہ بلوغت کے مراحل اور جنسی بے راہ روی کو موضوع بنایا ہے، جہاں نوخیز ذہن تجسس، الجھن اور نامعلوم خواہشات کے دباؤ میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس ”پھاہا“ اور ”شوشو“ میں لڑکیوں کی نفسیات، ان کی داخلی کیفیات اور جنسی اضطراب کو نمایاں کیا گیا ہے، جو سماجی جبر اور عدم آگاہی کے باعث مزید پیچیدہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان

افسانوں کے ذریعے منٹو انسانی نفسیات کے اُن پہلوؤں کو آشکار کرتے ہیں جو عموماً سماجی پردوں میں چھپے رہتے ہیں، اور یوں وہ اردو افسانے کو نفسیاتی حقیقت نگاری کی ایک نئی سطح تک پہنچا دیتے ہیں۔ افسانہ ”دھواں“ میں والدین کے جنسی فعل کو بتایا گیا ہے کہ کیسے وہ روز روشن میں مباشرت سرانجام دیتے ہیں جس کا برا اثر مسعود اور کلثوم پر ہوتا ہے۔ دونوں ہی وقت سے قبل بلوغت کی سرحد عبور کر لیتے ہیں اور مسعود کی بڑی بہن کلثوم جنسی لحاظ سے مشتعل ہو جاتی ہے۔ والدین کی غفلت بچوں کی جنسی بے راہ روی کا موجب بنتی ہے۔ بلوغت کی آمد کے ساتھ منٹو نے مسعود کی ذہنی کیفیت کا اظہار عمدگی سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دھکن پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی کی تو اسے مزہ آیا۔ اس کے جسم کے کس حصے میں اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز انک سی گئی تھی یہ چیز کیا تھی۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا، البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھینچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔“ (۱۰)

افسانہ ”دھواں“ میں مسعود کا ماں باپ کو مباشرت کرتے دیکھنا اور بہن کلثوم کے اپنی سہیلی سے ہم جنسیت کے تعلق کو دیکھ کر اپنی ذہنی و جسمانی کیفیت کو نا سمجھتے ہوئے بھی اسے ایک خوشگوار احساس ہوتا ہے:

”کلثوم جب مسعود سے کمر اور ٹانگیں دبواتے ہوئے لذت محسوس کرتی ہوئی ہولے ہولے، ہائے جائے، کرتی ہے تو وہ خوابیدہ جذبہ جس سے مسعود اب تک نا آشنا تھا۔ آنکھیں کھول دیتا ہے۔ اسے بھی رائے اور ایک بے نام سی لذت کا احساس ہونے لگتا ہے۔“ (۱۱)

منٹو نے جنسی اور نفسیاتی کیفیات کو موضوع بنا کر سماج کے اُن نادیدہ اور پوشیدہ پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے جو بظاہر معمولی دکھائی دیتے ہیں، مگر درحقیقت انسانی شخصیت پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہ کیفیات اکثر انسان سے انجانے میں سرزد ہوتی ہیں، لیکن ان کا اثر فرد تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ دوسروں کی زندگیوں میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں یہی داخلی اضطراب، نا آسودگی اور دبے ہوئے جذبات کرداروں کے رویوں اور اعمال کی صورت میں منتقل ہوتے نظر آتے ہیں، جس سے انسانی نفسیات کی پیچیدگی آشکار ہوتی ہے۔ افسانہ ”بلاؤز“ میں منٹو نے بلوغت کی سرحد پر قدم رکھنے والے مومن کی کہانی بیان کی ہے، جو ایک ایسے مرحلے سے گزر رہا ہے جہاں جسمانی تبدیلیاں اور ذہنی تجسس بیک وقت اس کی شخصیت کو متاثر کر رہے ہیں۔ مومن کی جنسی بے راہ روی کسی شعوری بدکاری کا نتیجہ نہیں بلکہ لاعلمی، تجسس اور دبے ہوئے احساسات کا فطری اظہار ہے، جس کے مفاہیم سے وہ خود بھی

پوری طرح واقف نہیں۔ منٹو نے اس افسانے میں نہایت باریک بینی سے ایک نوخیز ذہن کی الجھن، اضطراب اور نامعلوم خواہشات کو پیش کیا ہے، جو سماجی قد غنوں اور عدم آگاہی کے باعث مزید پیچیدہ صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ یوں ”بلاؤز“ محض ایک فرد کی کہانی نہیں رہتی بلکہ بلوغت کے اس نازک مرحلے میں انسانی نفسیات کی ایک علامتی تصویر بن جاتی ہے، جس کے ذریعے منٹو سماج کی تربیتی کوتاہیوں اور اخلاقی منافقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس نازک نفسیاتی موضوع کی کہانی میں منٹو نے اپنے تاثرات اور تصورات کو ایک ہی لڑی میں پرو کر یوں بیان کیا ہے:

”شکیلہ کے سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آ گیا۔ یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔“ (۱۲)

مومن چوں کہ نوخیز ہے اس لیے اسے ابھی ان باتوں کا علم نہیں ہے۔ وہ سراسیمگی کا شکار ہے اور اس لمحے میں ہے کہ جو اس نے دیکھا اس کا کیا نتیجہ نکالے۔ ایک دن جب وہ ٹرنک کھول کر عہد کے کپڑے دیکھتا ہے تو:

”رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔“ (۱۳)

منٹو کے ان موضوعات کو معاشرے نے فحش سمجھا اور اس پر قدغن بھی لگائی گئی لیکن دیکھا جائے تو معاشرے میں اس بات کی ضرورت بہت توجہ سے ہے کہ بچوں کو ان معاملات کی تعلیم دی جائے۔ انہیں بلوغت کے معانی و مفاہیم سے آشنا کیا جائے۔ مومن جس گھر میں نوکری کرتا ہے وہاں کی نوجوان لڑکیوں کو دیکھ اس کی بے راہ روی حد سے بڑھ جاتی ہے۔ اس کے جسم میں نامعلوم کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے ذہن پر بلاؤز مسلط ہے اور بالآخر ایک رات کو:

”جب وہ سویا تو اس نے کئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھے۔ ڈپٹی صاحب نے پتھر کے کونلوں کا ایک بڑا ڈھیر اس سے کونٹے کو کہا۔ جب اس نے ایک کونلہ اٹھایا اور اس پر ہتھوڑے کی ضرب لگائی تو وہ نرم نرم بالوں کا ایک گچھا بن گیا۔ یہ کالی کھانڈ کی مہین مہین تار تھے جن کا گولا بنا ہوا تھا۔ پھر یہ گولے اوپر جا کر پھٹنے لگے۔ پھر آندھی آگئی اور مومن کی رومی ٹوپی کا پھندنا کہیں جا کر غائب ہو گیا۔ پھندنے کی تلاش میں نکلا۔ دیکھی اور ان دیکھی جگہوں پر گھومتا رہا۔ ایک کالی ساٹن کے بلاؤز پر اس کا ہاتھ پڑا کچھ دیر تک وہ کسی دھڑکتی ہوئی چیز پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر دفعتاً ہڑبڑا کے اٹھا بیٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ سمجھ سکا کہ کیا ہو گیا۔“ (۱۴)

منٹو کے ہاں دوسرا بڑا موضوع جنس نگاری ہے۔ جنسی تحقیر و تذلیل پر مشتمل افسانوں میں ”ھتک اور خوشیا“ صف اول کے افسانے ہیں۔ افسانک ”ھتک میں عورت کی نسوانیت ہر چوٹ کی گئی ہے جبکہ ”خوشیا“ میں مرد کے وقار کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ دونوں کہانیوں میں انتہائی شدت اور حدت سے ذہنی کرب و بلا کا اظہار کیا گیا ہے۔ ”ھتک“ کا مرکزی کردار سوگندھی ایک بازاری عورت ہے۔ ایک رات رام لال دلال ایک سیٹھ کو اسی کی موٹر میں لے آتا ہے اور سوگندھی کو نیند سے جگاتا ہے جو بن سنور کر سیٹھ کے پاس جاتی

ہے۔ سیٹھ گاڑی کے اندر سے ہی ٹارچ کی روشنی ڈال کر سوگندھی کو دیکھتے ہوئے حقارت سے ”اونہہ“ کہتا ہے اور گاڑی بھگا کر لے جاتا ہے۔ سوگندھی کے لیے سیٹھ کی سونہہ تذلیل و تشنیع تھی جو اس کے ل و جگر کو تار تار کر دیتی ہے۔ سوگندھی ایک حساس، خود دار، نیک سیرت، خوش طبع اور رحم دل عورت ہے جس کی آنا اور خود داری کی چنگاری اس کے پیشے کی راکھ تلے دبی ہوئی ہے۔ وہ بازار عورت ہو کر بھی جنسی طور پر نا آسودہ ہے۔ اس کے اندر کی عورت زندہ ہے۔ منٹو نے اس افسانے میں جنسی تحقیر کا موضوع پیش نظر رکھا اور منٹو کے زور بیان اور شدت اظہار کے بہترین نمونے اس افسانے میں جا بجا ملتے ہیں: ”نادھو چلایا: ”سوگندھی“ سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا:

”سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے یہاں جو تجھے

پچاس روپے دے گی۔ یا تو کوئی ایسا گبرو جو ان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی

ہوں۔ کتے کینے! مجھ پر رعب گانھتا ہے۔ میں تیری دیل ہوں کیا؟ بھیک مانگے

تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے۔ میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟ چور یا گھکتر، اس

وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے۔ بلاؤں پولیس کو۔ پونے میں تجھ پر

کیس ہونہ ہو یہاں تو تجھ پر ایک کھڑا کر دوں۔“ (۱۵)

ہتک کا انجام چونکا دینے والا ہے۔ ایک عورت جو پیٹ کی خاطر خود کو دس روپے میں بیچ دیتی ہے اور دلال کا حصہ نکال کر اس کے پلے فقط ساڑھے سات روپے ہی پڑتے ہیں۔ طوائف کی زندگی کا المیہ ہے کہ جب تک سرمایہ دارانہ نظام رہے گا عورت کی یوں ہی ہتک جاری رہے گی۔ کرشن چندر نے ”ہتک“ افسانے کو کچھ یوں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ افسانہ ”خوشیا“ میں منٹو نے مردانہ کردار کو تحقیر کا نشانہ بنایا ہے۔ خوشیا جو کہ افسانے کا مرکزی کردار ہے اور رنڈیوں کا دلال بھی، جب وہ کانتا سے ملتا ہے تو اس کے لفظ لفظ میں خوشیا کے لیے تحقیر و تذلیل چھلکتی ہے۔ کانتا کا خوبصورت، سڈول اور سانولا جسم خوشیا کے اندر گھل گھل کر سرایت کرنے لگتا ہے۔ ان افسانوں میں انسانی نفسیات کو محرک بنا کر انسان کی فطری اور نارمل خواہش جس کی طویل عرصے تک تکمیل نہ ہو اور اس کو دبا دیا جائے تو ایک ذہنی جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ منٹو نے اس نفسیاتی حقیقت کو کمال فن سے افسانے کے قالب میں ڈھالا۔ افسانہ ”سڑک کے کنارے“ میں منٹو نے انسانی جذبات اور احساسات کو ہو بہو بیان کیا ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی نفسیاتی کہانی ہے جو اپنی پھڑ پھڑاتی ہوئی روح کو ایک ہر جانی کے حوالے کر دیتی ہے جو اس کی روح و جسم سے کھیل کر روفو چکر ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ماں بن جاتی ہے اور بطور ماں وہ تمام دنیا سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ ممتاز شیریں نے ”سڑک کے کنارے“ کو منٹو کی ادبی تکمیل کا مظہر کہا ہے۔

افسانہ نگاری کے فن میں منٹو نے جن موضوعات کو اپنے افسانوں میں استعمال کیا اس میں کچھ افسانوں کو فحش کہا گیا اور انہیں معتبہ ٹھہرایا گیا۔ ”کالی شلوار اور دھواں“ دونوں افسانوں کو حکومت نے قانون کی نظر میں فحش اور مخرت الاخلاق قرار دیا۔ افسانہ ”کھول دو“ فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ جو تلخ حقیقت اس افسانے میں موجود ہے وہ کسی اور میں نہیں ملتی۔ یہ کہانی سکینہ اور اس کے بوڑھے باپ سراج الدین کی ہے جس میں تقسیم کے بعد فسادات میں اس کی بیوی مر گئی اور بیٹی بچھڑ جاتی ہے۔ سراج الدین رضا کاروں سے بیٹی ڈھونڈنے کا کہتا ہے اور وہ اس کا حلیہ پوچھ کر اسے ڈھونڈنے کا کہہ کر تسلی دیتے ہیں۔ سکینہ رضا کاروں کو مل جاتی ہے لیکن سراج الدین کو نہیں۔ سراج الدین اسے دیکھنے جاتا ہے اس امید میں کہ شاید وہ سکینہ ہو۔ افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منٹو ایک پاگل سکھ کردار کے ذریعے اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ ایک آدمی کو خارجی دنیا سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اس پر

افسانوں اور علاقوں کی ادلابدلی کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے منٹو کی کہانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ماہر منٹو وارث علوی اس کہانی کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے لاجواب قرار دیتے ہیں۔ منٹو نے اپنی افسانہ نگاری میں جہاں معاشرے کے متنوع سماجی، معاشی اور تہذیبی مسائل کو موضوع بنایا، وہیں طوائف کی زندگی، اس کے مسائل اور اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بھی نہایت گہرائی اور دیانت داری سے پیش کیا۔ منٹو کے افسانوی کینوس پر طوائف محض ایک حاشیہ بردار کردار نہیں بلکہ ایک زندہ، حساس اور باطن میں ٹوٹا ہوا انسان ہے، جو سماج کے جبر، معاشی مجبوری اور اخلاقی منافقت کے درمیان پس رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کے بیشتر افسانوں میں طوائفیت اور جنسی زندگی کے حالات و واقعات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں، مگر یہ بیان محض جسمانی یا سطحی نہیں بلکہ سماجی اور نفسیاتی معنویت سے بھرپور ہے۔ منٹو نے جنس کو انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت کے طور پر پیش کیا اور اسے اخلاقی و عظیم سماجی تصنع کی عینک سے دیکھنے کے بجائے فطری اور حقیقی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک جنس انسانی جبلت کا لازمی حصہ ہے، جس کے اظہار کے لیے فطرتی آزادی ضروری ہے۔ جب سماج اس فطری عمل پر سخت پابندیاں عائد کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں بگاڑ، بے قاعدگی اور ذہنی انتشار جنم لیتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں یہی جنسی گھٹن نفسیاتی الجھنوں اور داخلی کرب کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

طوائفوں کی نفسیات اور ان کی زندگی کو مرکز بنا کر لکھے گئے افسانوں میں قاری کو جاگی، شارد، سوگندھی، سراج، زینت اور فوہا بانی جیسے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ تمام کردار اپنے اپنے انداز میں سماج کے ظلم، معاشی استحصال اور جذباتی محرومی کی علامت ہیں۔ منٹو نے ان عورتوں کو ہمدردی یا نفرت کے کسی ایک خانے میں قید نہیں کیا بلکہ انہیں مکمل انسان کے طور پر پیش کیا، جن کے اندر خواہش، خودداری، محبت اور اذیت سب بیک وقت موجود ہیں۔ منٹو اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ انسان کا ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ انسان جتنی زندگی خارجی سطح پر جیتا ہے، اس سے کہیں زیادہ ایک پوشیدہ اور داخلی زندگی بھی گزارتا ہے، جہاں خواہشات، ارمان اور ناکام تمنائیں جنم لیتی ہیں۔ جب یہ خواہشیں پوری نہیں ہوتیں تو نفسیاتی الجھنیں انسان کے وجود کو کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ منٹو نے اسی داخلی ٹوٹ پھوٹ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور انسانی نفسیات کی ان گہرائیوں تک رسائی حاصل کی جہاں اکثر ادیب قدم رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔

دیگر ترقی پسند مصنفین کے برعکس منٹو نے عام آدمی کے دکھ کو محض نظریاتی سطح پر نہیں دیکھا بلکہ اس کے درمیان جا کر اسے محسوس کیا۔ انہوں نے مظلوم انسان کے مسائل کو اپنا مسئلہ سمجھا اور اس کے درد کو غیر جانب دار اور بے لاگ انداز میں بیان کیا۔ منٹو کے افسانوں میں عام آدمی چاہے وہ بدکار ہو یا نیکوکار، عصمتوں کا دلال ہو یا کھولی میں رہنے والا محنت کش جسے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ ہو، فاقہ زدہ عورت ہو یا جسم فروشی کے ذریعے پیٹ پالنے والی طوائف سب یکساں انسانی حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ یوں منٹو کا افسانہ انسانی وجود کے کرب، جبر اور سچائی کا آئینہ بن جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن، پروفیسر، ”سعادت حسن منٹو اپنی تخلیقات کی روشنی میں (ایک نفسیاتی تجزیہ)، دارالاشاعت ترقی دہلی، ص ۵

۲۔ ایضاً، ص ۸۶

۳۔ سعادت حسن منٹو، ”مجموعہ کالی شلوار“، مکتبہ شعر و ادب سمن آباد لاہور، ص ۱۴۶

۴۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۷ء، ص ۳۸۱

- ۵۔ سعادت حسن منٹو، ”منٹو کے افسانے“، مکتبہ اردو بازار لاہور، بار دوم ۱۹۴۰ء، ص ۱۳
- ۶۔ ممتاز شیریں، ”منٹو: نوری نہ ناری“ ساقی بک ڈپو، دہلی ۱۹۹۱ء۔ ص: ۴۵-۴۶
- ۷۔ محمد طفیل (مرتب) نقوش، لاہور۔ منٹو نمبر ۴۹-۵۰ ادارہ فروغ اردو لاہور۔ ص- ۲۸۸
- ۸۔ وارث علوی ”سعادت حسن منٹو“ ساہتیہ اکادمی، پہلا ایڈیشن، ۱۹۹۵ء ص: ۴۴
- ۹۔ منٹو: ”دیوانہ شاعر“ مشمولہ ”آتش پارے اور سیاہ حاشیے“ ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۷ء ص: ۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸
- ۱۰۔ سعادت حسن منٹو، مجموعہ ’دھواں‘، ص ۱۲
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳
- ۱۲۔ سعادت حسن منٹو، مجموعہ ’منٹو کے افسانے‘، ۱۹۴۰ء، ص ۵۶
- ۱۳۔ ایضاً، ص ۵۷
- ۱۴۔ ایضاً، ص ۵۹
- ۱۵۔ سعادت حسن منٹو، منٹو کے یادگار افسانے، ص ۳۸